

تلخیص

تَفْهِيْمُ الْقَوْلِ

ترجمہ و تفسیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تلخیص

مولانا صدر الدین اصلاحی

الکھف

نام

اس سورہ کا نام پہلے رکوع کی نویں آیت اِذْ اَوٰی الْفُتٰیۃُ اِلٰی الْکَھْفِ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں کھف کا لفظ آیا ہے۔

زمانہ نزول

یہاں سے اُن سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جو کئی زندگی کے تیسرے دور میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ دور تقریباً ۱۵ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر قریب قریب ۱۰ نبوی تک چلتا ہے۔ اس دور میں قریش نے نبی ﷺ اور آپ کی تحریک اور جماعت کو دبانے کے لیے تضحیک، استہزاء، اعتراضات، الزامات، تحویف، اطماع اور مخالفانہ پروپیگنڈے سے آگے بڑھ کر ظلم و ستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار پوری سختی کے ساتھ استعمال کیے۔

سورہ کھف کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسرے دور کے آغاز میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ ظلم و ستم اور مزاحمت نے شدت تو اختیار کر لی تھی، مگر ابھی ہجرت حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحاب کھف کا قصہ سنایا گیا تاکہ ان کی ہمت بندھے اور انہیں معلوم ہو کہ اہل ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

موضوع اور مضمون

یہ سورہ مشرکین مکہ کے تین سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے نبی ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اہل کتاب کے مشورے سے آپ کے سامنے پیش کیے تھے: اصحاب کھف کون تھے؟ قصہ خضر کی حقیقت کیا ہے؟ اور ذوالقرنین کا کیا قصہ ہے؟ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبی کی زبان سے ان کے سوالات کا پورا جواب دیا، بلکہ اُن کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصوں کو پوری طرح اُس صورت حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اُس وقت مکہ میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی۔

۱- اصحاب کھف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور اُن کا حال مکہ کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رویہ کفار قریش کے رویہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہل ایمان

کو یہ سبق دیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہوا اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے، {چاہے اس کے لیے اسے گھر بار اور اہل و عیال سب کچھ چھوڑ دینا پڑے}۔

۲- اصحاب کھف کے قصے سے راستے نکال کر اس ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل پر گفتگو شروع کر دی گئی جو مکے کے سردار مسلمانوں کے ساتھ برت رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک طرف نبی ﷺ کو ہدایت کی گئی کہ نہ اُن ظالموں سے کوئی مصالحت کرو اور نہ اپنے غریب ساتھیوں کے مقابلے میں ان بڑے بڑے لوگوں کو کوئی اہمیت دو۔ دوسری طرف ان رئیسوں کو نصیحت کی گئی کہ اپنے چند روزہ عیش و زندگی پر نہ پھولو بلکہ ان بھلائوں کے طالب بنو جو ابدی اور پائدار ہیں۔

۳- اسی سلسلہ کلام میں قصہ خضر و موسیٰ کچھ اس انداز سے سنایا گیا ہے کہ اس میں کفار کے سوالات کا جواب بھی تھا اور مومنین کے لیے سامانِ تسلی بھی۔ اس قصے میں دراصل جو سبق دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے وہ چونکہ تمہاری نظر سے پوشیدہ ہیں، اس لیے تم بات بات پر حیران ہوتے ہو کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیا ہو گیا؟ حالانکہ اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو تمہیں خود معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔

۴- اس کے بعد قصہ ذوالقرنین ارشاد ہوتا ہے اور اس میں سانلوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم تو اپنی اتنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرمان روا اور ایسا زبردست فاتح اور اس قدر عظیم الشان ذرائع کا مالک ہو کر بھی اپنی حقیقت کو نہ بھولا تھا اور اپنے خالق کے آگے ہمیشہ سر تسلیم خم رکھتا تھا۔

خاتمہ کلام میں پھر انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے جو آغاز کلام میں ارشاد ہوئی ہیں، یعنی یہ کہ توحید اور آخرت سراسر حق ہیں اور تمہاری اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ انہیں مانو۔

﴿يَا أَيُّهَا ۱۰﴾ ﴿سُورَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ (۶۹)﴾ ﴿رُكُوعَاتُهَا ۱۲﴾

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ
 عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِّمَنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ
 الْهُومِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝
 مَا كَثُرِينَ فِيهِ أَبَدًا ۝ وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ
 وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً
 تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۝ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝ فَلَعَلَّكَ
 بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔^[۱] ٹھیک
 ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے، اور ایمان لا کر نیک عمل
 کرنے والوں کو خوش خبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ان لوگوں کو ڈر دے
 جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔^[۲] اس بات کا نہ انھیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا۔^[۳] بڑی بات
 ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔

اچھا، تو اے نبیؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔^[۴]

[۱] یعنی نہ اس میں کوئی ایچ پیچ کی بات ہے جو سمجھ میں نہ آ سکے، اور نہ کوئی بات حق و صداقت کے خط مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے جسے
 ماننے میں کسی راستی پسند انسان کو تامل ہو۔

[۲] یعنی جو خدا کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ اس میں عیسائی بھی شامل ہیں اور یہود بھی اور مشرکین عرب بھی۔

[۳] یعنی ان کا یہ قول کہ فلاں خدا کا بیٹا ہے، یا فلاں کو خدا نے بیٹا بنالیا ہے، کچھ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ ان کو خدا کے ہاں اولاد ہونے یا
 خدا کے کسی کو متبنیٰ بنانے کا علم ہے، بلکہ محض اپنی عقیدت مندی کے غلو میں وہ ایک من مانا حکم لگا بیٹھے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ وہ کسی
 سخت گمراہی کی بات کہہ رہے ہیں اور کتنی بڑی گستاخی اور افترا پر دازی ہے جو اللہ رب العالمین کی جناب میں ان سے سرزد ہو رہی ہے۔

[۴] یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اُس وقت نبی ﷺ مبتلا تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو رنج اُن

أَسْقَاۙ ۖ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زَيْنَةً لِّهَآ لِنَبْلُوَهُمْ أَیُّهُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا ۖ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝۸
أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ كَانُوا مِن

واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔^[۵]

کیا تم سمجھتے ہو کہ غار^[۶] اور کتبہ^[۷] والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے

تکلیفوں کا نہ تھا جو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، بلکہ جو چیز آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آپ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آپ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذاب الہی ہے۔ آپ ان کو اس سے بچانے کے لیے اپنے دن اور راتیں ایک کیے دے رہے تھے۔ مگر انہیں اصرار تھا کہ وہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر رہیں گے۔ اپنی اس کیفیت کو نبی ﷺ خود ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ”میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی روشنی کے لیے، مگر پروانے ہیں کہ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں جل جانے کے لیے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں، مگر پروانے اس کی ایک نہیں چلنے دیتے۔ ایسا ہی حال میرا ہے کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑتے ہو۔“ (بخاری و مسلم نیز تقابل کے لیے ملاحظہ ہوا شعراء، آیت ۳)

اس آیت میں بظاہر تو بات اتنی ہی فرمائی گئی ہے کہ شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے کھود دو گے، مگر اسی میں ایک لطیف انداز سے آپ کو تسلی بھی دے دی گئی کہ ان کے ایمان نہ لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس لیے تم کیوں اپنے آپ کو رنج و غم میں گھلائے دیتے ہو؟ تمہارا کام صرف بشارت اور انداز ہے، لوگوں کو مومن بنادینا تمہارا کام نہیں ہے۔ لہذا تم بس اپنا فریضہ تبلیغ ادا کیے جاؤ۔ جو مان لے اسے بشارت دے دو۔ جو نہ مانے اسے بُرے انجام سے متنبہ کر دو۔

[۵] پہلی آیت کا خطاب نبیؐ سے تھا اور ان دونوں آیتوں کا روئے سخن کفار کی جانب ہے۔ نبیؐ کو ایک حرف تسلی دینے کے بعد اب آپ کے منکرین کو مخاطب کیے بغیر یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہ سر و سامان جو زمین کی سطح پر تم دیکھتے ہو اور جس کی دل فریبیوں پر تم فریفتہ ہو، یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض تمہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے تمہارے عیش و عشرت کے لیے فراہم کیا ہے، اس لیے تم زندگی کے مزے لوٹنے کے سوا اور کسی مقصد کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور اسی لیے تم کسی سمجھانے والے کی بات پر کان بھی نہیں دھرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سامانِ عیش نہیں بلکہ وسائلِ امتحان ہیں جن کے درمیان تم کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ تم میں سے کون اپنی اصل کو فراموش کر کے دنیا کی ان دل فریبیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور کون اپنے اصل مقام (ہندگی رب) کو یاد رکھ کر صحیح رویے پر قائم رہتا ہے۔ جس روز یہ امتحان ختم ہو جائے گا اسی روز یہ بساطِ عیش اٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔

[۶] عربی زبان میں ”کہف“ وسیع غار کو کہتے ہیں اور ”غار“ کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اردو میں غار کہف کا ہم معنی ہے۔

[۷] الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اور وہ ایلہ (یعنی عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ اور بعض قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحاب کہف کی

اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝۹ اِذْ اَوٰی الْفِثٰیۃُ اِلٰی الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا
اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰
فَضَرَبْنَا عَلٰی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝۱۱
ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اٰیَ الْغَزَبِیْنِ اَحْصٰی لَهَا لِبٰتُؤًا اَمَدًا ۝۱۲
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْنَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ

تھے؟^[۸] جب وہ چند نو جوان غار میں پناہ گزین ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ”اے پروردگار، ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے“، تو ہم نے انہیں اُسی غار میں تھپک کر سا لہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا، پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں اُن کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔
ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں۔^[۹] وہ چند نو جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور

یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ”ترجمان القرآن“ میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائبل کی کتاب یسوع (باب ۱۸- آیت ۲۷) میں رقم یارقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیڑا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتاب یسوع میں رقم یارقم کا ذکر بنی بن یمن کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اردن اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیڑا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیڑا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں اس کے اور بنی بن یمن کی میراث کے درمیان تو یہود اور آدومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققین آثار قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیڑا اور رقم ایک چیز ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۳۶ء، جلد ۷- ص ۶۵۸)۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقم سے مراد کتبہ ہے۔

[۸] یعنی کیا تم اس خدا کی قدرت سے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، اس بات کو کچھ بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو دو تین سو برس تک سلائے رکھے اور پھر ویسا ہی جوان و تندرست جگا اٹھائے جیسے وہ سوئے تھے؟ اگر سورج اور چاند اور زمین کی تخلیق پر تم نے کبھی غور کیا ہوتا تو تم ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ خدا کے لیے یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

[۹] اس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابن جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ لیکن نے اپنی کتاب ”تاریخ زوال و سقوطِ دولتِ روم“ کے باب ۳۳ میں ”سات سونے والوں“ (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان ماخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس

وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۱۳ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا
رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ
قُلْنَا إِذْ شَطَطًا ۱۴ هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ إِلَهًا
لَوْ لَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ

ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی^[۱۰]۔ ہم نے ان کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اٹھے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ”ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔“ (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) ”یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص

بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحاب کھف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے ہمارے مفسرین اس کا نام دَقیئوس یا دقانیوس یا دقئوس بتاتے ہیں اور گین کہتے ہیں کہ وہ قیصر دسیس (Decius) تھا۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین افسس یا افسوس لکھتے ہیں، اور گین اس کا نام افسس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کھف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین جیڈوسیس لکھتے ہیں اور گین کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسی (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کھف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین جَمْلِیجُا بتاتے ہیں اور گین اسے جَمْلِیجُس (Jamblichus) لکھتا ہے۔ قصے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں۔ {ان کی رو} سے غار میں ان لوگوں کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین نے اس قصے کو قصہ اصحاب کھف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن اُن کے قیام غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب ہم نے حاشیہ ۲۵ میں دے دیا ہے۔

اس سُرِیانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گین نے نبی ﷺ پر ”جہالت“ کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے اور اتنی مدت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

[۱۰] یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ابتدائی دور سے پیر وان مسیح میں سے تھے اور رومی سلطنت کی رعایا تھے جو اس وقت مشرک تھی اور اہل توحید کی سخت دشمن ہو رہی تھی۔

عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝ وَإِذْ اَعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ اِلَّا اللَّهُ
فَاَوَّا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيَهَيِّئْ لَكُمْ
مِّنْ اَمْرِكُمْ مَّرْفَقًا ۝ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا اَطْلَعَتْ تَزْوُرُ عَن
كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْاَيْمَنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ
وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللَّهِ ط مَنْ يَّهْدِ اللَّهُ
فَهُوَ الْهَادِ ۝ وَمَنْ يُّضِلَّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْسِدًا ۝ ۱۶

سے بڑا عالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔^[۱۱] تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا۔“

تم انھیں غار میں دیکھتے^[۱۲] تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔^[۱۳] یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے، جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پاسکتے۔

[۱۱] جس زمانے میں ان خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی اُس وقت شہر افسس ایشیائے کوچک میں بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنادیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے (ملاحظہ ہوا نائیکو پیڈیا آف بلیکل لٹریچر۔ عنوان (Ephesus)۔ شرک اور اہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا اُس کا اندازہ اصحاب کہف کے اُس فقرے سے کیا جاسکتا ہے، جو اگلے رکوع میں آ رہا ہے، کہ ”اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے۔“

[۱۲] بچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا کہ اس قرارداد باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا ارتداد پر مجبور کیے جانے سے بچ جائیں۔

[۱۳] یعنی ان کے غار کا دہانہ شمال کے رخ تھا جس کی وجہ سے سورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ آيَاتًا وَهُمْ رُقُودٌ ۖ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ
وَذَاتَ الشَّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۖ لَوِ
اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَكَلِمَتْ مِنْهُمْ رُعبًا ۝۱۸
وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ
كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالُوا رَبُّكُمْ
أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۖ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى
الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ
مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ ۖ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۝۱۹ إِنَّهُمْ

تَلَفُّفُ الْقَوْمِ بِالْغَيْبِ عَنِ الْمَوْتِ وَأَنَّ الْقَاءَ بَعْدَ الْيَمِينِ وَالشَّمَالِ
الْمَدِينَةِ الْأَوَّلَى وَالْآخِرَةَ مِنَ النَّصْفِ الْأَخْفَرِ

تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلاتے رہتے تھے۔^[۱۴] اور ان کا لگنا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو اٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی۔^[۱۵]

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ”کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟“ دوسروں نے کہا ”شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔“ پھر وہ بولے ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں اُن لوگوں کا ہاتھ ہم پر

[۱۴] یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

[۱۵] یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے گتے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔

[۱۶] یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی عجیب کرشمہ قدرت ان کا ایک طویل مدت کے بعد جاگنا بھی تھا۔

إِنْ يَّظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ
وَلَنْ تُمْلِكُوا إِذَا آتَاكُمُ الْمَوْلَىٰ ۚ وَكَذَٰلِكَ أَغْتَرْنَا عَلَيْهِمْ
لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا ۚ
إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۚ

پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے، اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا^[۱۷] تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آ کر رہے گی۔^[۱۸] (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات تھی) اُس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا ”ان پر ایک دیوار چُن دو،

[۱۷] یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ بُت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس ہر چیز میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ دوسو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی جج دھج، لباس، زبان ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دکان دار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُریانی روایت کی رو سے دکان دار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دھنڈا نکال لایا ہے۔ چنانچہ اس نے اُس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص تو اُن پیروان مسیح میں سے ہے جو دوسو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آنا فانا شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحاب کہف خبردار ہوئے کہ وہ دوسو برس بعد سوکراٹھے ہیں تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔

[۱۸] سُریانی روایت کے مطابق اُس زمانے میں وہاں قیامت اور عالم آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ انفس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اُس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ اسی وجہ سے منکرین آخرت کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنین آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت اصحاب کہف کے بعث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہم پہنچا دیا۔

رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۖ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۖ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّاٰهُمْ كَلْبُهُمْ ۖ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَا مِنْهُمْ كَلْبُهُمْ ۖ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۚ فَلَا تُبَارِكُ فِيهِمْ

ان کا رب ہی ان کے معاملہ کو بہتر جانتا ہے۔^[۱۹] مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے^[۲۰] انہوں نے کہا ”ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔“^[۲۱]

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کُلتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کُلتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہاں کتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کُلتا تھا۔^[۲۲] کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے

[۱۹] انداز کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحین نصاریٰ کا قول تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اصحاب کہف جس طرح غار میں لیٹے ہوئے ہیں اسی طرح انہیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تینا لگا دو، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔

[۲۰] پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، اصحاب کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور حضرت مریمؑ کے ”مادر خدا“ ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروان مسیح کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کا رہنے ہوئے تھے۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علم بردار تھے اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحاب کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

[۲۱] مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکان آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی اسے انہوں نے ارتکاب شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے جب کہ نبی ﷺ اس طرح کے متعدد ارشادات اس کی نفی میں موجود ہیں کہ: ”اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔“ (احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ)

۱۵ إِلَّا مِرَآءَ ظَاهِرًا ۖ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۚ
وَلَا تَقُولَنَّ لِسَائِي ۖ إِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۚ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ
اللَّهُ ۚ وَادْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَى أَنْ يَهْدِيَنِّي رَبِّي

معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔ [۲۳] ع۔ اور دیکھو، کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے) اِلَّا یہ کہ اللہ چاہے۔ اگر بھولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو اور کہو ”امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رُشد سے قریب تر بات کی طرف

نبی ﷺ { کہ اسی طرح کے صریح ارشادات } کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پار دیوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایتاً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟ اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے ”ایشیائے کوچک کے اکتشافات“ (Discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر ففس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریم اور ”سات لڑکوں“ (یعنی اصحاب کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

[۲۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نزول قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے، اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ تاہم چونکہ تیسرے قول کی تردید اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے اس لیے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔

[۲۳] مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسباب دنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے، اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہ حق میں قدم اٹھادینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس ”عادت جاریہ“ کو لوگ ”قانون فطرت“ سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سلا کر اس طرح اٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس امتداد زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوع انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اٹھا دینا، جس کی خبر انبیاء اور کتب آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمہ چشم بصیرت بنانے کے بجائے التامزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحاب کہف کا جو معجزہ اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے

لَا قَرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا ﴿۲۳﴾ وَلَیْسُوا فِی کَہْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَاَزْدًا ذُوْا اِیْسًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَیْسُوا

میری رہنمائی فرمادے گا۔“ [۲۳] اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں ۹۰ سال اور بڑھ گئے ہیں۔ [۲۵] تم کہو، اللہ ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے، [۲۵الف]

آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انہیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے۔ یہ ہیں وہ اصل سبق جو آدمی کو اس قصے سے لینے چاہئیں اور اس میں توجہ کے قابل یہی امور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحاب کھف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور ان کا لگتا کس رنگ کا تھا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھملکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اور آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم ان میں نہ الجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوق فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

[۲۳] یہ ایک جملہ معترضہ ہے جو پچھلی آیت کے مضمون کی مناسبت سے سلسلہ کلام کے بیچ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پچھلی آیت میں ہدایت کی گئی تھی کہ اصحاب کھف کی تعداد کا صحیح علم اللہ کو ہے اور اس کی تحقیق کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، لہذا خواہ مخواہ ایک غیر ضروری بات کی کھوج میں لگنے سے پرہیز کرو، اور اس پر کسی سے بحث بھی نہ کرو۔ اس سلسلہ میں آگے کی بات ارشاد فرمانے سے پہلے جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور ہدایت بھی نبی ﷺ اور اہل ایمان کو دی گئی اور وہ یہ کہ تم کبھی دعوے سے یہ نہ کہہ دینا کہ میں کل فلاں کام کر دوں گا۔ تم کو کیا خبر کہ تم وہ کام کر سکو گے یا نہیں۔ نہ تمہیں غیب کا علم، اور نہ تم اپنے افعال میں ایسے خود مختار کہ جو کچھ چاہو کر سکو۔ اس لیے اگر کبھی بے خیالی میں ایسی بات زبان سے نکل بھی جائے تو فوراً متنبہ ہو کر اللہ کو یاد کرو اور ان شاء اللہ کہہ دیا کرو۔ مزید برآں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس کام کے کرنے کو تم کہہ رہے ہو، آیا اس میں خیر ہے یا کوئی دوسرا کام اس سے بہتر ہے۔ لہذا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہا کرو کہ امید ہے میرا رب اس معاملے میں صحیح بات، یا صحیح طریقہ عمل کی طرف میری رہنمائی فرمادے گا۔

[۲۵] اس فقرے کا تعلق ہمارے نزدیک جملہ معترضہ سے پہلے کے فقرے کے ساتھ ہے۔ یعنی سلسلہ عبارت یوں ہے کہ ”کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا لگتا تھا، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور بعض لوگ اس مدت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے ہیں۔“ اس عبارت میں ۳ سو اور تین سو نو سال کی تعداد جو بیان کی گئی ہے ہمارے خیال میں یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی، تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

[۲۵الف] یعنی اصحاب کھف کی تعداد کی طرح ان کی مدت قیام کے بارے میں بھی لوگوں کے درمیان اختلاف ہے مگر تمہیں اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت اس حال میں رہے۔ ط

لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ مَا لَهُمْ
مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَّوْلا يَشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۚ (۲۶) وَأَثَلُ مَا
أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَنْ تَجِدَ
مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۚ (۲۷) وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوَةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ

آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اُسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا! (زمین و آسمان کی مخلوقات کا) کوئی خبر گیر اُس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اے نبیؐ، [۲۶] تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا توں) سنا دو، کوئی اُس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے، (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں رد و بدل کرو گے تو) اُس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے۔ [۲۷] اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار

[۲۶] اصحاب کھف کا قصہ ختم کرنے کے بعد اب یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے اور اس میں اُن حالات پر تبصرہ ہے جو اس وقت مکہ میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔

[۲۷] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس وقت نبی ﷺ کفار مکہ کی خاطر قرآن میں کچھ رد و بدل کر دینے اور سردارانِ قریش سے کچھ کم و بیش پر مصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے منع فرما رہا تھا۔ بلکہ دراصل اس میں روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے اگرچہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے۔ مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد ﷺ خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اسے بے کم و کاست پہنچا دیں۔ تمہیں ماننا ہے تو اس پورے دین کو جوں کا توں مانو جو خداوند عالم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو۔ مگر یہ امید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمہیں راضی کرنے کے لیے اس دین میں تمہاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو۔ یہ جواب ہے اُس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمہاری پوری بات مان لیں۔ آخر کچھ تو ہماری آبائی دین کے عقائد اور رسم و رواج کی رعایت ملحوظ رکھو۔ کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمہاری مان لیں۔ اس پر سمجھو یہ ہو سکتا ہے اور برادری پھوٹ سے بچ سکتی ہے۔ قرآن میں ان کے اس مطالبے کا متعدد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ یونس کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو: وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٌ قَالُوا الَّذِيْنَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَتَىٰ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلَهُ۔ ”جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔“

عَيْنَكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِيعْ
مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ
فُرْطًا ۝ وَقِيلَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ ۚ

بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟^[۲۸] کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو^[۲۹] جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔^[۳۰] صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے

[۲۸] ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق، قریش کے سردار نبی ﷺ سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خطابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ، جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں بٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آ سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الہی کی خاطر تمہارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب و روز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، ان کی معیت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم ان مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ دنیوی ٹھاٹھ بٹھر رکھنے والے لوگ تمہارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بھی بظاہر خطاب نبی ﷺ سے ہے، مگر سنانا دراصل سرداران قریش کو مقصود ہے کہ تمہاری یہ دکھاوے کی شان و شوکت، جس پر تم پھول رہے ہو، اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ ٹھیک یہی معاملہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ۔ ”ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو ذلیل لوگ ہیں وہ بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔“ اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ مَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا، ”میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا،“ اور وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا، جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انہیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے۔“ (ہود، آیات ۲۷-۲۹-۳۱۔ نیز سورۃ انعام، آیت ۵۲ اور سورۃ الحجر، آیت ۸۸)

[۲۹] یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ جھکو، اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو۔ یہاں ”اطاعت“ کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

[۳۰] كَانَ أَمْرُهُ فُرْطًا کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑ کر بگڑ چلنے والا ہے۔“ دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے۔ جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حدود نا آشنا ہو جائے۔ اور جس جس وادی میں مطاع بھٹکے اسی میں مطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔

وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۖ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۖ لَا أَحَاطُ
بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۖ وَإِنْ يَسْتَعِثُّوا نُيُغَاثُّوا بِمَاءٍ كَالْهَمَلِ
يَشْوِي الْوُجُوهُ ۖ يَبْسُ الشَّرَابُ ۖ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۹

اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔^[۳۱] ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔^[۳۲] وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا^[۳۳] اور ان کا منہ بھون ڈالے گا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بُری آرام گاہ!

[۳۱] یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اصحاب کھف کا قصہ سننے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحاب کھف کے جو واقعات اوپر بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے کس طرح اٹھ کر دو ٹوک بات کہہ دی کہ ”ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔“ اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ ”ہم اُس کے سوا کسی دوسرے الہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے۔“ اور کس طرح انہوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سر و سامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انہیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدا نخواستہ ہماری قوم ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ ان واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے۔ اور سنانا دراصل مخالفین اسلام کو مقصود ہے۔ کہ ان مشرکین اور منکرین حق سے مصالحت قطعاً خارج از بحث ہے۔ جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے اسے بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کر دو۔ مانتے ہیں تو مانیں، نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے۔ جنہوں نے مان لیا ہے، خواہ وہ کم سن نوجوان ہوں، یا بے مال و زرقمیر، یا غلام اور مزدور، بہر حال وہی قیمتی جواہر ہیں، انہی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا، اور ان کو چھوڑ کر اُن بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پروانہ کی جائے گی جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔

[۳۲] سُر اوق کے اصل معنی ہیں قناتیں اور سراپردے جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ لیکن جہنم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سُر اوق سے مراد اس کے وہ بیرونی حدود ہیں جہاں تک اس کی لپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ”اس کے سُر اوق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“ بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت میں جہنم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے۔ لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے منہ موڑنے والے ظالم یہیں سے جہنم کی لپٹ میں آ چکے ہیں اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

[۳۳] لغت میں ”مُہل“ کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنی ”تیل کی تلچھٹ“ بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ ”لاوے“ کے معنی میں آتا ہے، یعنی زمین کے وہ مادے جو شدت حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی پیپ اور لہو کے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ
أَحْسَنَ عَمَلًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَدَّتْ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ
الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا
خُضْرًا مِّنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ
نِعْمَ الثَّوَابُ ۖ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۖ ﴿۳۱﴾ وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا
رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا
بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۖ ﴿۳۲﴾ كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ اتَتَا
أُكْلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا ۖ وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ۖ ﴿۳۳﴾

رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکو کار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیے سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے، [۳۲] باریک ریشم اور اٹلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور اونچی مسندوں [۳۵] پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام [۱] اے نبیؐ، ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ [۳۶] دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور اُن کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اُن باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی

[۳۴] قدیم زمانے میں بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے تھے۔ اہل جنت کے لباس میں اس چیز کا ذکر کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ وہاں ان کو شاہانہ لباس پہنائے جائیں گے۔ ایک کافر و فاسق بادشاہ وہاں ذلیل و خوار ہوگا اور ایک مومن و صالح مزدور وہاں بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے رہے گا۔

[۳۵] اراٹک جمع ہے اریکہ کی۔ اریکہ عربی زبان میں ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر چتر لگا ہوا ہو۔ اس سے بھی یہی تصور دلانا مقصود ہے کہ وہاں ہر جنتی تخت شاہی پر متمکن ہوگا۔

[۳۶] اس مثال کی مناسبت سمجھنے کے لیے پچھلے رکوع کی وہ آیت نگاہ میں رہنی چاہیے جس میں مکے کے متکبر سرداروں کی اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آکر نہیں بیٹھ سکتے، انہیں ہٹا دیا جائے تو ہم آکر سنیں گے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس مقام پر وہ مثال بھی لگا میں رہے جو سورۃ القلم، آیات ۷ تا ۳۳ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ نیز سورۃ مریم، آیات ۷۳، ۷۴۔ سورۃ المؤمنون، آیات ۵۵ تا ۶۱۔ سورۃ نبا، آیات ۳۲ تا ۳۶، اور حم السجدۃ، آیات ۴۹، ۵۰ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ
 مِنْكَ مَا لَا وَعَدْنَفَرًا ۝۳۳ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ
 لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝۳۴ وَمَا
 أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِّدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَإَجِدَنَّ خَيْرًا
 مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۵ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ
 بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّكَ
 رَجُلًا ۝۳۶ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝۳۸

اور اسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا ”میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت و نفری رکھتا ہوں۔“ پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا [۳۴] اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا ”میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شان دار جگہ پاؤں گا۔“ [۳۸] اُس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا ”کیا تو کفر کرتا ہے اُس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟“ [۳۹] رہا میں، تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

[۳۷] یعنی جن باغوں کو وہ اپنی جنت سمجھ رہا تھا۔ کم ظرف لوگ جنہیں دنیا میں کچھ شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے، ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں دنیا ہی میں جنت نصیب ہو چکی ہے، اب اور کون سی جنت ہے جسے حاصل کرنے کی وہ فکر کریں۔
 [۳۸] یعنی اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے بھی تو میں وہاں اس سے بھی زیادہ خوش حال رہوں گا کیونکہ یہاں میرا خوش حال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں خدا کا محبوب اور اس کا چہیتا ہوں۔

[۳۹] اگرچہ اُس شخص نے خدا کی ہستی سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ وَلَئِن رُّدِّدْتُ إِلَىٰ رَبِّي کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کا قائل تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے ہمسائے نے اسے کفر باللہ کا مجرم قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر باللہ محض ہستی باری کے انکار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تکبر اور نفخ و غرور اور انکار آخرت بھی اللہ سے کفر ہی ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ بس میں ہی میں ہوں، میری دولت اور شان و شوکت کسی کا عطیہ نہیں بلکہ میری قوت و قابلیت کا نتیجہ ہے، اور میری دولت لازوال ہے، کوئی اس کو مجھ سے چھیننے والا نہیں، اور کسی کے سامنے مجھے حساب دینا نہیں، وہ اگر خدا کو مانتا بھی ہے تو محض ایک وجود کی حیثیت سے مانتا ہے، اپنے مالک اور آقا اور فرماں روا کی حیثیت سے نہیں مانتا۔ حالانکہ ایمان باللہ اسی حیثیت سے خدا کو مانتا ہے نہ کہ محض ایک موجود ہستی کی حیثیت سے۔

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتِكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ
 إِنَّ تَرْنَ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۖ فَعَلِمَىٰ رَبِّي أَنِ
 يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ
 فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا ۚ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غُورًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ
 لَهُ طَلَبًا ۝۳۱ وَأُحِيطَ بِشَرِّهِ ۖ فَاصْبِرْ ۖ يَقْلِبْ كَقَبِهِ عَلَىٰ مَا
 أُنْفِقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَلَيْتَنِي
 لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝۳۲ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ
 مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝۳۳ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ
 لِلَّهِ الْحَقِّ ۖ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝۳۴ وَاضْرِبْ لَهُمُ
 مَّثَلِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا ۖ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ
 بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيحُ ۝۳۵

اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ، لا قوۃ الا باللہ؟ [۳۱] اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پارہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرمادے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے، یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔“ آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کوٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتارہ گیا اور کہنے لگا کہ ”کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہوتا۔“ نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ اس وقت معلوم ہوا کہ کار سازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے، انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے یا اور اے نبی، انھیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی، اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اُڑائے لیے پھرتی ہیں۔

[۳۰] ”یعنی جو کچھ اللہ چاہے وہی ہوگا۔ میرا اور کسی کا کچھ زور نہیں ہے۔ ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ ہی کی توفیق و تائید سے

چل سکتا ہے۔“

وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝۳۱
 زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَالْبَاقِيَةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ ۖ عِنْدَ
 رَبِّكَ ثَوَابٌ وَخَيْرٌ أَمَلًا ۝۳۲ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى
 الْأَرْضَ بَارِزَةً ۖ وَحَشَرْنَهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝۳۳
 وَعُرِضُوا عَلَى رَبِّكَ صَفًّا ۖ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ
 أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ مَوْعِدًا ۝۳۴

اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔^[۳۱] یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ فکر اُس دن کی ہونی چاہیے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے،^[۳۲] اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے،^[۳۳] اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا،^[۳۴] اور سب کے سب تمہارے رب کے حضور صرف درصاف پیش کیے جائیں گے۔ لو دیکھ لو، آگئے نا تم ہمارے پاس اُسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔^[۳۵] تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے

[۳۱] یعنی وہ زندگی بھی بخشتا ہے اور موت بھی۔ وہ عروج بھی عطا کرتا ہے اور زوال بھی۔ اس کے حکم سے بہار آتی ہے تو خزاں بھی آ جاتی ہے۔ اگر آج تمہیں عیش اور خوش حالی میسر ہے تو اس غزے میں نہ رہو کہ یہ حالت لازوال ہے۔ جس خدا کے حکم سے یہ کچھ تمہیں ملا ہے اسی کے حکم سے سب کچھ تم سے چھن بھی سکتا ہے۔

[۳۲] یعنی جب کہ زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور پہاڑ اس طرح چلنے شروع ہوں گے جیسے بادل چلتے ہیں۔ اس کیفیت کو ایک دوسرے مقام پر قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسِبُهَا جَمَادَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل، آیت: ۸۸) ”تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ سخت جڑے ہوئے ہیں۔ مگر وہ چلیں گے اس طرح جیسے بادل چلتے ہیں۔“

[۳۳] یعنی اس پر کوئی روئیدگی اور کوئی عمارت باقی نہ رہے گی، بالکل ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ یہ وہی بات ہے جو اس سورے کے آغاز میں ارشاد ہوئی تھی کہ ”جو کچھ اس زمین پر ہے اسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کے لیے ایک عارضی آرائش بنایا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بالکل ایک بے آب و گیاہ صحرا بن کر رہ جائے گی۔“

[۳۴] یعنی ہر انسان جو آدم سے لے کر قیامت کی آخری ساعت تک پیدا ہوا ہے، خواہ ماں کے پیٹ سے نکل کر اس نے ایک ہی سانس لیا ہو، اُس وقت دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور سب کو ایک وقت میں جمع کر دیا جائے گا۔

[۳۵] یعنی اس وقت منکرین آخرت سے کہا جائے گا کہ دیکھو، انبیاء کی دی ہوئی خبر سچی ثابت ہوئی نا۔ وہ تمہیں بتاتے تھے کہ جس طرح اللہ نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا مگر تم اسے ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بتاؤ، اب دوبارہ تم پیدا ہو گئے یا نہیں؟

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ
وَيَقُولُونَ يُوَيْلَتَنَا مَا لِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً
وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا
يُظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ
رَبِّهِ ۖ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِنِي وَهُمْ

اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ”ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو۔“ جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔ [۳۶] یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ [۳۷] وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔ [۳۸] اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اُس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو

[۳۶] یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اُس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہوگا کہ آدمی کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے یا بے گناہ پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔ [۳۷] اس سلسلہ کلام میں قصہ آدم و ابلیس کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود گمراہ انسانوں کو ان کی اس حماقت پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار اور خیر خواہ پیغمبروں کو چھوڑ کر اپنے اُس ازلی دشمن کے پھندے میں پھنس رہے ہیں جو اوّل روز آفرینش سے ان کے خلاف حسد رکھتا ہے۔

[۳۸] یعنی ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنوں میں سے تھا، اسی لیے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لیے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرۃ مطیع فرمان ہیں: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (التحریم: ۶) ”اللہ جو حکم بھی ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔“ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (النحل: ۵۰) ”وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“ بخلاف اس کے جنوں انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے جسے پیدا کئی فرماں بردار نہیں بنایا گیا ہے بلکہ کفر و ایمان اور طاعت و معصیت، دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اسی حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اس لیے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح ان تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا اور فرشتہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ معلم الملکوت۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہوا لجر، آیت ۲۷۔ اور الجن، آیات ۱۳-۱۵)

رہا یہ سوال کہ جب ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو پھر قرآن کا یہ طرز بیان کیوں صحیح ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم کو

لَكُمْ عَذَابٌ يُطْءَسُ لِلظَّالِمِينَ ۝۵۰ مَا أَشْهَدُ لَهُمْ خَلْقَ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ ۝ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ
الْمُضِلِّينَ عِزْدًا ۝۵۱ وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ
رَعِمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ
مُؤَبَقًا ۝۵۲ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا

حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی بُرا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔ میں نے آسمان وزمین پیدا کرتے وقت اُن کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود اُن کی اپنی تخلیق میں انھیں شریک کیا تھا۔^[۳۹] میرا یہ کام نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں۔

پھر کیا کریں گے یہ لوگ اُس روز جب کہ ان کا رب ان سے کہے گا کہ پکارو اب اُن ہستیوں کو جنہیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔^[۵۰] یہ اُن کو پکاریں گے، مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے۔^[۵۱] سارے مجرم اُس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انھیں اس میں گرنا ہے

سجدہ کرو پس ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کا حکم دینے کے معنی یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقات ارضی بھی انسان کی مطیع فرمان بن جائیں جو کرۂ زمین کی عمل داری میں فرشتوں کے زیر انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سر بسجود ہوئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ (لفظ ابلیس کے معنی کے لیے ملاحظہ ہو المؤمنون، حاشیہ ۷۳)

[۳۹] مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین آخر تمہاری طاعت و بندگی کے مستحق کیسے بن گئے؟ بندگی کا مستحق تو صرف خالق ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان شیاطین کا حال یہ ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق میں شریک ہونا تو درکنار، یہ تو خود مخلوق ہیں۔

[۵۰] یہاں پھر وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے بھی کئی جگہ قرآن میں گزر چکا ہے کہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے احکام اور رہنمائی کا اتباع کرنا دراصل اس کو خدائی میں اللہ کا شریک ٹھہرانا ہے، خواہ آدمی اُس دوسرے کو زبان سے خدا کا شریک قرار دیتا ہو یا نہ قرار دیتا ہو۔ بلکہ اگر آدمی اُن دوسری ہستیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی امر الہی کے مقابلے میں ان کے ادا امر کا اتباع کر رہا ہو تب بھی وہ شرک کا مجرم ہے۔ چنانچہ یہاں شیاطین کے معاملے میں آپ علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ہر ایک ان پر لعنت کرتا ہے، مگر اس لعنت کے باوجود جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، قرآن اُن سب کو یہ الزام دے رہا ہے کہ تم شیاطین کو خدا کا شریک بنائے ہوئے ہو۔ یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ شرک عملی ہے اور قرآن اس کو بھی شرک ہی کہتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، النساء، حاشیہ ۹۱-۱۳۵، الانعام، حاشیہ ۸۷-۱۰۷، التوبہ، حاشیہ ۳۱-۳۲، ابراہیم، حاشیہ ۳۲-۳۳، مریم، حاشیہ ۲۷-۲۸، المؤمنون، حاشیہ ۲۱-۲۲، الفرقان، حاشیہ ۵۶-۵۷، القصص، حاشیہ ۸۶-۸۷، سبا، حاشیہ ۵۹-۶۰، یونس، حاشیہ ۶۲-۶۳، لیسین، حاشیہ ۵۳-۵۴، الشوری، حاشیہ ۳۸-۳۹، الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

[۵۱] مفسرین نے اس آیت کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے اوپر ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ”ہم ان کے درمیان عداوت ڈال دیں گے۔“ یعنی دنیا میں ان کے درمیان جو دوستی تھی آخرت میں وہ سخت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔

وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ۖ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ ۙ
لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا
رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ
قُبُلًا ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ
وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ
وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُرُوعًا ۝ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ

اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ اُن کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر اُن کو کس چیز نے روک دیا؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پہلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے، یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں! [۵۲]

رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں۔ [۵۳] مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو جو انھیں کی گئیں مذاق بنالیا ہے۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے

[۵۲] یعنی جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے، قرآن نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی ہے۔ دل اور دماغ کو اپیل کرنے کے جتنے مؤثر طریقے اختیار کرنے ممکن تھے، وہ سب بہترین انداز میں یہاں اختیار کیے جا چکے ہیں۔ اب وہ کیا چیز ہے جو انہیں قبول حق میں مانع ہو رہی ہے؟ صرف یہ کہ انہیں عذاب کا انتظار ہے۔ جوتے کھائے بغیر سیدھے نہیں ہونا چاہتے۔

[۵۳] اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ رسولوں کو ہم اسی لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ بے وقوف لوگ ان پیشگی تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اسی انجام بد کو دیکھنے پر مُصر ہیں جس سے رسول انہیں بچانا چاہتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو عذاب ہی دیکھنا منظور ہے تو پیغمبر سے اس کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ پیغمبر عذاب دینے کے لیے نہیں بلکہ عذاب سے پہلے صرف خبردار کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدْ مَتَّ يَدُهُ إِنَّا
 جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا
 وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ۝۵۴ وَرَبُّكَ
 الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ طُؤْيُؤًا اخِذْهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَلْ لَهُمُ
 الْعَذَابُ ط بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْئِلًا ۝۵۵
 وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِبَهْلِكِهِمْ

اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے منہ پھیرے اور اُس بُرے انجام کو بھول جائے جس کا
 سر و سامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے؟ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے
 غلاف چڑھا دیے ہیں جو انہیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے، اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم
 انہیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔ [۵۴]

تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انہیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج
 دیتا۔ مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے۔ [۵۵]
 یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ [۵۶] انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا،
 اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔

[۵۴] یعنی جب کوئی شخص یا گروہ دلیل و حجت اور خیر خواہانہ نصیحت کے مقابلے میں جھگڑا لوپن پر اتر آتا ہے، اور حق کا مقابلہ
 جھوٹ اور مکرو فریب کے ہتھیاروں سے کرنے لگتا ہے، اور اپنے کرتوتوں کا برا انجام دیکھنے سے پہلے کسی کے سمجھانے سے اپنی غلطی ماننے پر
 تیار نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ پھر اس کے دل پر قفل چڑھا دیتا ہے اور اس کے کان ہر صدائے حق کے لیے بہرے کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ نصیحت
 سے نہیں مانا کرتے بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں گر کر رہی انہیں یقین آتا ہے کہ وہ ہلاکت تھی جس کی راہ پروہ بڑھے چلے جا رہے تھے۔

[۵۵] یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے قصور سرزد ہو اسی وقت پکڑ کر اسے سزا دے ڈالے۔ یہ اس کی شان
 رحیمی کا تقاضا ہے کہ مجرموں کے پکڑنے میں وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا اور مدتوں ان کو سنہلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر سخت نادان ہیں
 وہ لوگ جو اس ڈھیل کو غلط معنی میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ خواہ کچھ ہی کرتے رہیں، ان سے کبھی باز پرس ہوگی ہی نہیں۔

[۵۶] اشارہ ہے سبا اور ثمود اور مدین اور قوم لوط کے اجڑے دیاروں کی طرف جنہیں قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں
 آتے جاتے دیکھا کرتے تھے اور جن سے عرب کے دوسرے لوگ بھی خوب واقف تھے۔

مَوْعِدًا ۱۸۰ وَ اِذْ قَالَ مُوسٰی لِفَتٰىہٗ لَا اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ ۱۸۱
 الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضٰی حُقُبًا ۱۸۲ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَہُمَا نَسِیَا
 حُوتَہُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ۱۸۳ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ
 لِفَتٰىہٗ اِنِّیْ اَعْدَاۤءٌ نَّآ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۱۸۴
 قَالَ اَرَءِیْتَ اِذَا وُیِّنَا اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوتَ ۱۸۵
 وَمَا اَنْسٰیہٗ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَ ۱۸۶ وَ اتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی

(ذرا ان کو وہ قصہ سنا جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جب کہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ”میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔“ [۱۸۰] پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا ”لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بُری طرح تھک گئے ہیں۔“ خادم نے کہا ”آپ نے دیکھا! یہ کیا ہوا؟ جب ہم اُس چٹان کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے اُس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر

[۱۸۱] اس مرحلہ پر یہ قصہ سننے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرماں برداروں پر مصائب کا جھوم، بدکاروں کا عیش اور نیکو کاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کُنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگر ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانہ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جس میں وہ ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا۔ لیکن ابن عباسؓ سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کتب حدیث میں منقول ہیں وہ اس بیان کی تائید

نہیں کرتیں، اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی مصر میں رہے تھے۔ بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تہ میں گزرا۔ اس لیے یہ روایت تو قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ جب ہم خود اس قصے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغاز نبوت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ کو ان مشاہدات کی ضرورت اُس زمانے میں پیش آئی ہوگی جب کہ بنی اسرائیل کو بھی اُسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (والعلم عند اللہ) کہ اس واقعہ کا تعلق اُس دور سے ہے جب کہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے باز پرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدا یا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰ یہ پکار اٹھے تھے کہ رَبَّنَا اِنَّكَ اَتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَامْلَاةُ زَيْنَةَ وَاَمَمَؤَالَا فِی الْحَیْوَةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ اے پروردگار، تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹک دیں؟“

اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابيض اور البحر الازرق آکر ملتی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی پوری زندگی جن علاقوں میں گزاری ہے ان میں اس ایک مقام کے سوا اور کوئی مجمع البحرین نہیں پایا جاتا۔

بائیل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تلمود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت موسیٰ کے بجائے ربی یہوحنان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ ربی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔ (The Talmud Selections By H. Palano, pp. 313-16) ممکن ہے کہ خروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں۔ تلمود کی اسی روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تلمود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جاسکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا گیا ہوگا، اور پھر جب کہ معتبر احادیث میں حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی ﷺ نے اس قصے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ بنیغیر بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائق التفات نہیں رہتا۔

مستشرقین مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اس قصے کے بھی ماخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، اور تین قصوں پر انگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد ﷺ نے نقل کر کے یہ قصہ بنالیا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اوپر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک داستان گلگامیش، دوسرے سکندر نامہ سریانی، اور تیسرے وہ یہودی روایت جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بدطینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہر حال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے، اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت ہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد ﷺ نے اس میں پیش کیا ہے یہ فلاں فلاں مقامات سے

الْبَحْرُ عَجَبًا ﴿۱۶﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبِغُ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِهِمَا

دریا میں چلی گئی۔“ موسیٰ نے کہا ”اسی کی تو ہمیں تلاش تھی۔“ [۵۸] چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے

چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرز تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں کہ بے اختیار گھبنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر۔ ان کی اس متعصبانہ افترا پر دازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

اول یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انہی کتابوں سے ماخوذ ہے؟

دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں آپ لوگوں نے قرآن مجید کے قصوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دی ہیں اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکے میں اُس وقت موجود تھا اور مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمدؐ کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار اُن دو تین سفروں پر ہے جو نبیؐ نے نبوت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لائے تھے؟ اور اعلان نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

تیسرے یہ کہ کفار مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد ﷺ یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سرفے کا پتہ نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انہیں تو بار بار تحدیٰ کی جارہی تھی کہ یہ قرآن منزل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے معاصر دشمنان اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار، شک ہی کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج معاصرین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہر حال ہے نہ کہ قرآن منزل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے انہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے منہج ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنالیا گیا کہ قرآن اُن قصوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے ”علم“ کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالب علم کے لیے قابل التفات نہیں ہے۔

[۵۸] یعنی منزل مقصود کا یہی نشان تو ہم کو بتایا گیا تھا۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور ان کو منزل مقصود کی علامت یہی بتائی گئی تھی کہ جہاں ان کے ناشتے کی مچھلی غائب ہو جائے وہی مقام اس بندے کی ملاقات کا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔

قَصَصًا ۞ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اتَّيَّنَتْ رَحْمَةُ مِّنْ
عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِمَّا نَّادَىٰ عِلْمًا ۞ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ
اتَّبَعَكَ عَلَىٰ أَنَّ تُعَلِّمَ مِمَّا عَلَّمْتَ رُشْدًا ۞ قَالَ إِنَّكَ لَنُ
تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۞ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ
خُبْرًا ۞ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي
لَكَ أَمْرًا ۞ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى
أُحَدِّثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۞ فَانْطَلَقَا ۞ وَحَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي
السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۞ قَالَ أَخَرَقْتُهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۞ لَقَدْ جِئْتَ

اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے
ایک خاص علم عطا کیا تھا۔ [۵۹]

موسیٰ نے اس سے کہا ”کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی تعلیم دیں جو
آپ کو سکھائی گئی ہے؟“ اس نے جواب دیا ”آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخراً
اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔“ موسیٰ نے کہا ”اِنْ شَاءَ اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی
نافرمانی نہ کروں گا۔“ اس نے کہا ”اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں
خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔“ ۷

اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف
ڈال دیا۔ موسیٰ نے کہا ”آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈوب دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت

[۵۹] اس بندے کا نام تمام معتبر احادیث میں خضر بتایا گیا ہے۔ اس لیے اُن لوگوں کے اقوال کسی التفات کے مستحق نہیں ہیں جو
اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر حضرت الیاس کی طرف اس قصے کو منسوب کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول نہ صرف اس بنا پر غلط ہے کہ نبی ﷺ
کے ارشاد سے متصادم ہوتا ہے، بلکہ اس بنا پر بھی سراسر لغو ہے کہ حضرت الیاسؑ حضرت موسیٰؑ کے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔
حضرت موسیٰؑ کے خادم کا نام بھی قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں ذکر ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نونؑ تھے جو
بعد میں حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ ہوئے۔

شَيْئًا اِمْرًا ۱۱ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۱۲
 قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ اَمْرِي
 عُسْرًا ۱۳ فَانْطَلَقَا ۱۴ وَفَقَّحَتْهُ اِذَا لَقِيَا غُلَمًا فَقَتَلَهُ ۱۵ قَالَ
 اَقْتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكَرًا ۱۶
 قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۱۷
 قَالَ اِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۱۸ قَدْ بَلَغْتَ
 مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۱۹ فَانْطَلَقَا ۲۰ وَفَقَّحَتْهُ اِذَا آتٰ اَهْلَ قَرْيَةٍ ۲۱ اِسْتَطْعَمَا
 اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُصَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ اَنْ
 يَنْقُضَ فَاقَامَهُ ۲۲ قَالَ لَوْ شِئْتُ لَتَخَذْتُ عَلَيْهِ اجْرًا ۲۳ قَالَ هَذَا
 فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۲۴ سَأُنَبِّئُكَ بِتَاوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ
 صَبْرًا ۲۵ اَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ

حرکت کر ڈالی۔“ اُس نے کہا ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟“ موسیٰ نے کہا ”بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔“

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰ نے کہا ”آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا۔“ اُس نے کہا ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟“ موسیٰ نے کہا ”اِس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے، اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔“

پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر انہوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اُس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰ نے کہا ”اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے۔“ اُس نے کہا ”بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکتے۔ اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔

فَارَدْتُ أَنْ أَعْيِيهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ
 غَصْبًا ۝۶۹ وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبُوهُمُ الْمُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا
 طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝۷۰ فَارَدْنَا أَنْ يُبَدِّلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّنْهُ زَكَاةٌ
 وَأَقْرَبَ رَحْمًا ۝۷۱ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي
 الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزُ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ
 رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ
 ۝۷۲ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۳

مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکتے۔“ [۶۰]

[۶۰] اس قصہ میں ایک بڑی پیچیدگی ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے۔ حضرت خضر نے یہ تین کام جو کیے ہیں ان میں سے تیسرا کام تو خیر شریعت سے نہیں ٹکراتا، مگر پہلے دونوں کام یقیناً اُن احکام سے متصادم ہوتے ہیں جو ابتدائے عہد انسانیت سے آج تک تمام شرائع الہیہ میں ثابت رہے ہیں۔ کوئی شریعت بھی کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کی مملوکہ چیز کو خراب کر دے، اور کسی تنفس کو بے تصور قتل کر ڈالے۔ حتیٰ کہ اگر کسی انسان کو بطریق الہام بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کشتی کو آگے جا کر ایک غاصب چھین لے گا، اور فلاں لڑکا بڑا ہو کر سرکش اور کافر نکلے گا، تب بھی اس کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں سے کسی شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس الہامی علم کی بنا پر کشتی میں چھید کر دے اور ایک بے گناہ لڑکے کو مار ڈالے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ حضرت خضر نے یہ دونوں کام اللہ کے حکم سے کیے تھے، فی الواقع اس پیچیدگی کو کچھ بھی رفع نہیں کرتا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حضرت خضر نے یہ کام کس کے حکم سے کیے تھے۔ ان کا حکم الہی سے ہونا تو بالیقین ثابت ہے کیونکہ حضرت خضر خود فرماتے ہیں کہ ان کے یہ افعال ان کے اختیاری نہیں ہیں بلکہ اللہ کی رحمت ان کی محرک ہوئی ہے، اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ خود فرما چکا ہے کہ حضرت خضر کو اللہ کی طرف سے ایک علم خاص حاصل تھا۔ پس یہ امر تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ کام اللہ کے حکم سے کیے گئے تھے۔ مگر اصل سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ

کے ان احکام کی نوعیت کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ تشریحی احکام نہ تھے، کیونکہ شرائع الہیہ کے جو بنیادی اصول قرآن اور اس سے پہلے کی کتب آسمانی سے ثابت ہیں ان میں کبھی کسی انسان کے لیے یہ گنجائش نہیں رکھی گئی کہ وہ بلا ثبوت جرم کسی دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ احکام اپنی نوعیت میں اللہ تعالیٰ کے اُن تکوینی احکام سے مشابہت رکھتے ہیں جن کے تحت دنیا میں ہر آن کوئی بیمار ڈالا جاتا ہے اور کوئی تندرست کیا جاتا ہے، کسی کو موت دی جاتی ہے اور کسی کو زندگی سے نوازا جاتا ہے، کسی کو تباہ کیا جاتا ہے اور کسی پر نعمتیں نازل کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ تکوینی احکام ہیں تو ان کے مخاطب صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں شرعی جواز و عدم جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی اختیار کے بغیر صرف اوامر الہیہ کی تعمیل کرتے ہیں۔ رہا انسان، تو خواہ وہ بلا ارادہ کسی تکوینی حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنے، اور خواہ الہاماً اس طرح کا کوئی غیبی علم اور حکم پا کر اس پر عمل درآمد کرے، بہر حال وہ گنہگار ہونے سے نہیں بچ سکتا اگر وہ کام جو اس نے کیا ہے کسی حکم شرعی سے ٹکراتا ہو۔ اس لیے کہ انسان بحیثیت اس کے کہ وہ انسان ہے، احکام شرعیہ کا مکلف ہے اور اصول شریعت میں کہیں یہ گنجائش نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لیے محض اس بنا پر احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعہ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعہ علم غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابر صوفیہ بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے تفصیل کے ساتھ عبد الوہاب شعرانی، محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، جنید بغدادی، سہری سقسی، ابوالحسین النوری، ابوسعید الخدری، ابوالعباس احمد الدینوری اور امام غزالی رحمہم اللہ جیسے نامور بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا جو صاحب الہام تک کے لیے جائز نہیں ہے، جو خضوع کے خلاف ہو۔ (روح المعانی، ج ۱۶، ص ۱۸، ۱۶)

اب کیا ہم یہ مان لیں کہ اس قاعدہ کلیہ سے صرف ایک انسان مستثنیٰ کیا گیا ہے اور وہ ہیں حضرت خضر؟ یا یہ سمجھیں کہ حضرت خضر کوئی انسان نہ تھے بلکہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیت الہی کے تحت (نہ کہ شریعت الہی کے تحت) کام کرتے ہیں؟

پہلی صورت کو ہم تسلیم کر لیتے اگر قرآن بالفاظ صریح یہ کہہ دیتا کہ وہ ”بندہ“ جس کے پاس حضرت موسیٰ اس تربیت کے لیے بھیجے گئے تھے، انسان تھا۔ لیکن قرآن اس کے انسان ہونے کی تصریح نہیں کرتا بلکہ صرف عِبَادًا مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کے الفاظ بولتا ہے جو ظاہر ہے کہ اُس بندے کے انسان ہونے کو مستلزم نہیں ہیں، قرآن مجید میں متعدد جگہ فرشتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۃ انبیاء، آیت ۲۶۔ اور سورۃ زخرف، آیت ۱۹۔ پھر کسی صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے بھی کوئی ایسا ارشاد منقول نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ حضرت خضر کو نوع انسانی کا ایک فرد قرار دیا گیا ہو۔ اس باب میں مستند ترین روایات وہ ہیں جو عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس، عن ابی بن کعب، عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے ائمہ حدیث کو پہنچی ہیں۔ ان میں حضرت خضر کے لیے صرف رَجُل کا لفظ آیا ہے، جو اگرچہ مرد انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر انسانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں یہ لفظ جنوں کے لیے مستعمل ہو چکا ہے جیسا کہ سورۃ جن میں ارشاد ہوا ہے: وَ اِنَّكَ تَكُنْ رِجَالًا مِّنَ الْاِنْسِ يَعْوَذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ جن یا فرشتہ کوئی اور غیر مرئی وجود جب انسانوں کے سامنے آئے گا تو انسانی شکل ہی میں آئے گا اور اس حالت میں اس کو بشر یا انسان ہی کہا جائے گا۔ حضرت مریمؑ کے سامنے جب فرشتہ آیا تھا تو قرآن اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے کہ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا پس نبی ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”وہاں انہوں نے ایک مرد کو پایا“ حضرت خضر کے انسان ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم ”خضر“ کو انسان نہ مانیں بلکہ فرشتوں میں سے، یا اللہ کی کسی اور ایسی مخلوق میں سے سمجھیں جو شرائع کی مکلف نہیں ہے بلکہ کارگاہ مشیت کی کارکن ہے۔ متقدمین میں سے بھی بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ماوردی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

اور اے نبی، یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔^[۶۱] ان سے کہو، میں اس کا کچھ حال تم کو سناتا ہوں۔^[۶۲]

[۶۱] وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْنَيْنِ کا عطف لامحالہ پچھلے قصے ہی پر ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قصہ موسیٰ و خضر بھی لوگوں کے سوال ہی کے جواب میں سنایا گیا ہے اور یہ بات ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے کہ اس سورے کے یہ تینوں اہم قصے دراصل کفار مکہ نے اہل کتاب کے مشورے سے امتحاناً دریافت کیے تھے۔

[۶۲] یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ ”ذوالقرنین“ جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، کون تھا۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا، لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہے۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرماں روا خورس (خسر یا سائرس) کی طرف ہے۔ اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے، مگر بہر حال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیت کو اس کا مصداق نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ قرآن مجید جس طرح اس کا ذکر کرتا ہے اس سے ہم کو چار باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس کا لقب ذوالقرنین (لغوی معنوی ”دو سینگوں والا“) کم از کم یہودیوں میں، جن کے اشارے سے کفار نے اس کے بارے میں نبی ﷺ سے سوال کیا تھا، ضرور معروف ہونا چاہیے۔ اس لیے لامحالہ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے اسرائیلی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ وہ ”دو سینگوں والے“ کی حیثیت سے کس شخصیت یا سلطنت کو جانتے تھے۔

(۲) وہ ضرور کوئی بڑا فرماں روا اور فاتح ہونا چاہیے جس کی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچے ہوں، اور تیسری جانب شمال یا جنوب میں وسیع ہوئی ہوں۔ ایسے شخصیتیں نزول قرآن سے پہلے چند ہی گزری ہیں اور لامحالہ ان ہی میں سے کسی میں اس کی دوسری خصوصیات ہمیں تلاش کرنی ہوں گی۔

(۳) اس کا مصداق ضرور کوئی ایسا فرماں روا ہونا چاہیے جس نے اپنی مملکت کو یا جوں و ماجوں کے حملوں سے بچانے کے لیے کسی پہاڑی درے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہو۔ اس علامت کی تحقیق کے لیے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ یا جوں و ماجوں سے مراد کون سی قومیں ہیں، اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے علاقے سے متصل کون سی ایسی دیوار کبھی دنیا میں بنائی گئی ہے اور وہ کس نے بنائی ہے۔

(۴) اس میں مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت بھی پائی جانی چاہیے کہ وہ خدا پرست اور عادل فرماں روا ہو، کیوں کہ قرآن یہاں سب سے بڑھ کر اس کی اسی خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان میں سے پہلی علامت آسانی کے ساتھ خورس پر چسپاں کی جاسکتی ہے، کیوں کہ بائبل کے صحیفہ دانی ایل میں دانیال علیہ السلام نبی کا جو خواب بیان کیا گیا ہے اس میں وہ یونانیوں کے عروج سے قبل میڈیا اور فارس کی متحدہ سلطنت کو ایک مینڈھے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ جس کے دو سینگ تھے۔ یہودیوں میں اس ”دو سینگوں والے“ کا بڑا چرچا تھا کیوں کہ اسی کی ٹکڑے آ خر کا بابل کی سلطنت کو پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی۔ (سورہ بنی اسرائیل حاشیہ ۸) دوسری علامت بڑی حد تک اس پر چسپاں ہوتی ہے، مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی فتوحات بلاشبہ مغرب میں ایشیائے کوچک اور شام کے سواصل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہوئیں، مگر شمال یا جنوب میں اس کی کسی بڑی مہم کا سراغ ابھی تک تاریخ سے نہیں ملا ہے، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ ایک تیسری مہم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ تاہم اس مہم کا پیش آنا بعید از قیاس نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کی رو سے خورس کی سلطنت شمال میں کاکیشیا (قفقاز) تک وسیع تھی۔

اِنَّا مَكِّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَاتَّبَعِ
سَبَبًا ۝ حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ
حَمِئَةٍ ۚ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۙ قُلْنَا يٰۤاِنَّ الْقَرْنَيْنِ اِمَّا اَنْ تُعَذَّبَ

ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے۔ اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سر و سامان کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا [۶۳] تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا [۶۴] اور وہاں اُسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا ”اے ذوالقرنین، تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف

تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب تحقیق ہے کہ یا جوج ماجوج سے مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاری منگولی، بھن اور سیٹھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملہ کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں در بند اور دار یال کے استحکامات تعمیر کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ خورس ہی نے یہ استحکامات تعمیر کیے تھے۔

آخری علامت قدیم زمانے کے معروف فاتحوں میں اگر کسی پر چپاں کی جاسکتی ہے تو وہ خورس ہی ہے۔ کیونکہ اس کے دشمنوں تک نے اس کے عدل کی تعریف کی ہے اور بائبل کی کتاب عزرا اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ضرور ایک خدا پرست اور خدا ترس بادشاہ تھا جس نے بنی اسرائیل کو ان کی خدا پرستی کی بنا پر بابل کی اسیری سے رہا کیا اور اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کے لیے بیت المقدس میں دوبارہ بیکل سلیمانی کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس بنا پر ہم یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نزول قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحین عالم گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر ”ذوالقرنین“ کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں، لیکن تعین کے ساتھ اسی کو ذوالقرنین قرار دے دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے۔

تاریخی بیان کے لیے صرف اتنا ذکر کافی ہے کہ خورس ایک ایرانی فرماں روا تھا جس کا عروج ۵۴۹ ق م کے قریب زمانے میں شروع ہوا۔ اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال) اور لیڈیا (ایشیائے کوچک) کی سلطنتوں کو ضم کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابل کو بھی فتح کر لیا جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستہ میں مزاحم نہیں رہی۔ اُس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صغد (موجودہ ترکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک، اور دوسری طرف تھریس اور مقدونیہ تک وسیع ہو گیا اور شمال میں اس کی سلطنت قفقاز (کاکیشیا) اور خوارزم تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابع فرمان تھی۔

[۶۳] غروب آفتاب کی حد سے مراد، جیسا کہ ابن کثیر نے لکھا ہے: اقصیٰ مایسلک فیہ من الارض من ناحیہ المغرب ہے نہ کہ آفتاب غروب ہونے کی جگہ۔ مراد یہ کہ مغرب کی جانب ملک پر ملک فتح کرتا ہوا خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا جس کے آگے سمندر تھا۔

[۶۴] یعنی وہاں غروب آفتاب کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج سمندر کے سیاہی مائل گدے لے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اگر فی الواقع ذوالقرنین سے مراد خورس ہی ہو تو یہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہوگا جہاں بحر احمین چھوٹی چھوٹی غلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس قیاس کی تائید بات بھی کرتی ہے کہ قرآن یہاں بحر کے بجائے عین کا لفظ استعمال کرتا ہے جو سمندر کے بجائے چھیل یا خلیج ہی پر زیادہ صحت کے ساتھ بولا جاسکتا ہے۔

وَاِمَّا اَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿۸۷﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ
نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ يَرْدُّہٗ اِلٰی رَبِّہٖ فَيُعَذِّبُہٗ عَذَابًا مُّکْرًا ﴿۸۸﴾ وَاَمَّا مَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاءٌ اِلْحُسْنٰی وَسَنَقُولُ لَہٗ مِنْ اَمْرِنَا
یُسْرًا ﴿۸۹﴾ ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ﴿۹۰﴾ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا
تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ یَجْعَلْ لَّہُمْ مِنْ دُوْنِہَا سِتْرًا ﴿۹۱﴾ کَذٰلِکَ وَقَدْ
اَحْطٰنَا بِمَا لَدِیْہِ خُبْرًا ﴿۹۲﴾ ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ﴿۹۳﴾ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ

پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔“ [۶۵] اس نے کہا، ”جوان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹا یا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جوان میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کے لیے اچھی جزا ہے۔ اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔“

پھر اُس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ [۶۶] یہ حال تھا ان کا، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اُسے ہم جانتے تھے۔

پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا [۶۷]

[۶۵] ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات براہ راست وحی یا الہام کے ذریعہ ہی سے ذوالقرنین کو خطاب کر کے فرمائی ہو، حتیٰ کہ اس سے ذوالقرنین کا نبی یا محدث ہونا لازم آئے۔ بلکہ یہ ارشاد زبان حال کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہی قرین قیاس ہے۔ ذوالقرنین اُس وقت فتح یاب ہو کر اس علاقے پر قابض ہوا تھا۔ مفتوح قوم اس کے بس میں تھی۔ اللہ نے اس صورت حال میں اس کے ضمیر کے سامنے یہ سوال رکھ دیا کہ یہ تیرے امتحان کا وقت ہے۔ یہ قوم تیرے آگے بے بس ہے۔ تو ظلم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور شرافت کا سلوک کرنا چاہے تو یہ بھی تیرے اختیار میں ہے۔

[۶۶] یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہنچ گیا جہاں مہذب دنیا کی سرحد ختم ہو گئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار خیمے بنانا تک نہ جانتی تھیں۔

[۶۷] چونکہ آگے یہ ذکر آ رہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یا جوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لیے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد اکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحر خزیر (کپسین) اور بحر اسود کے درمیان واقع ہیں۔

السَّادِّينَ وَجَدَمِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا^[۶۸] لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا^{۶۳}
 قَالُوا اِيْذَا الْقُرْنَيْنِ اِنَّ يَأْجُوجَ وَمَاجُوجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ
 نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا^{۶۴} قَالَ مَا
 مَكْنٰى فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
 رَدْمًا^{۶۵} اَتُوْنِ زُبْرًا حَدِيْدًا حَتّٰى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ
 قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰى اِذَا جَعَلَهُ نَارًا^{۶۶} قَالَ اَتُوْنِ اَفْرِغْ عَلَيْهِ قَطْرًا^{۶۷}
 فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهُ نَقْبًا^{۶۸} قَالَ

تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔^[۶۸] اُن لوگوں نے کہا کہ ”اے ذوالقرنین، یا جوج اور ماجوج^[۶۹] اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ تو کیا ہم تجھے کوئی ٹکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟“ اس نے کہا ”جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔“^[۷۰] مجھے لوہے کی چادریں لادو۔“ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ کر دی تو اس نے کہا ”لاؤ، اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا۔“ (یہ بند ایسا تھا کہ) یا جوج و ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا

[۶۸] یعنی اس کی زبان ذوالقرنین اور اس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔ سخت وحشی ہونے کے سبب سے نہ کوئی ان کی زبان سے واقف تھا اور نہ وہ کسی غیر زبان سے واقف تھے۔

[۶۹] یا جوج و ماجوج سے مراد، جیسا کہ اوپر حاشیہ نمبر ۶۲ میں اشارہ کیا جا چکا ہے، ایشیا کے شمال مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اُٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رخ کرتے رہے ہیں۔ بائبل کی کتاب پیدائش (باب: ۱۰) میں ان کو حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حذقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ تو بالک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسفوس اُن سے مراد سیٹھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحر اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کا کیشیا کے شمال میں بحرِ بختر کے قریب آباد تھے۔

[۷۰] یعنی فرماں روا ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کو غارت گروں کے حملے سے بچاؤں۔ اس کام کے لیے تم پر کوئی الگ ٹکس لگانا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ ملک کا جو خزانہ اللہ تعالیٰ نے میرے حوالے کیا ہے وہ اس خدمت کے لیے کافی ہے۔ البتہ ہاتھ پاؤں کی محنت سے تم کو میری مدد کرنی ہوگی۔

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّيۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَّبِّيۚ جَعَلَهُ دَكَّآءٍ وَكَانَ
وَعْدُ رَّبِّيۚ حَقًّا ۝۹۸ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمۡ يَوْمَئِذٍ يَّوۡجُ فِيۡ بَعْضٍ وَنُفِخَ
فِي الصُّوۡرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝۹۹ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِيۡنَ
عَرَضًا ۝۱۰۰ اِلَّذِيۡنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكْرِيۡ وَكَانُوۡا
لَا يَسۡتَظۡهِمُوۡنَ سَمْعًا ۝۱۰۱ اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا

”یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا، [۹۸] اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔“ [۹۹]

اور اُس روز [۹۸] ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور صُور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ اور وہ دن ہوگا جب ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے، اُن کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ تو کیا [۹۹] یہ لوگ، جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے، یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا

[۹۸] یعنی اگرچہ میں نے اپنی حد تک انتہائی مستحکم دیوار تعمیر کی ہے، مگر یہ لازوال نہیں ہے۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے، یہ قائم رہے گی، اور جب وہ وقت آئے گا جو اللہ نے اس کی تباہی کے لیے مقدر کر رکھا ہے تو پھر اس کو پارہ پارہ ہونے سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔ ”وعدے کا وقت“ ذومعنی لفظ ہے۔ اس سے مراد اس دیوار کی تباہی کا وقت بھی ہے اور وہ ساعت بھی جو اللہ نے ہر چیز کی موت اور فنا کے لیے مقرر فرمادی ہے، یعنی قیامت۔

[۹۹] یہاں پہنچ کر ذوالقرنین کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ اگرچہ کفارِ مکہ کے امتحانی سوال پر سنایا گیا ہے، مگر قصہ اصحاب کہف اور قصہ موسیٰ و خضر کی طرح اس کو بھی قرآن نے اپنے قاعدے کے مطابق اپنے مدعا کے لیے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ذوالقرنین جن کی عظمت کا حال تم نے اہل کتاب سے سنا ہے، محض ایک فاحش ہی نہ تھا، بلکہ توحید اور آخرت کا قائل تھا، عدل و انصاف اور فیاضی کے اصولوں پر عامل تھا، اور تم لوگوں کی طرح کم ظرف نہ تھا کہ ذرا سی سرداری ملی اور سمجھ بیٹھے کہ ہم چومن دیگرے نیست۔

[۱۰۰] یعنی قیامت کے روز۔ ذوالقرنین نے جو اشارہ قیامت کے وعدہ برحق کی طرف کیا تھا اسی کی مناسبت سے یہ فقرے اُن کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

[۱۰۱] یہ پوری سورت کا خاتمہ کلام ہے، اس لیے اس کی مناسبت ذوالقرنین کے قصے میں نہیں بلکہ سورۃ کے مجموعی مضمون میں تلاش کرنی چاہیے۔ سورۃ کا مجموعی مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم کو شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور دنیا پرستی چھوڑ کر آخرت پر یقین لانے کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر قوم کے بڑے بڑے سردار اپنی دولت اور شوکت و حشمت کے زعم میں نہ صرف آپ کی اس دعوت کو رد کر رہے تھے، بلکہ اُن چند راستی پسند انسانوں کو بھی، جنہوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی، ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس پر وہ ساری تقریر کی گئی جو شروع سورہ سے یہاں تک چلی آ رہی ہے، اور اسی تقریر کے دوران میں یکے بعد دیگرے اُن تین قصوں کو بھی، جنہیں مخالفین نے امتحاناً دریافت کیا تھا، ٹھیک موقع پر نگیمنوں کی طرح جڑ دیا گیا۔ اب تقریر ختم کرتے ہوئے پھر کلام کا رخ اسی مدعا کی طرف پھیرا جا رہا ہے جسے تقریر کے آغاز میں پیش کیا گیا تھا اور جس پر رکوع ۴ سے ۸ تک مسلسل گفتگو کی جا چکی ہے۔

عِبَادِي مِنْ دُونِي اُولِيَاءُ اِنَّا اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ﴿١٢﴾
 قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِينَ اَعْمَالًا ﴿١٣﴾ الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ
 فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٤﴾
 اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
 فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ﴿١٥﴾ ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمَ بِمَا

کار ساز بنا لیں؟ [۴۵] ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔ اے نبیؐ، ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی [۴۶] اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے [۴۷] ان کی جزا جہنم ہے اُس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اُس

[۴۵] یعنی کیا یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان کا خیال یہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ روش ان کے لیے نافع ہوگی؟

[۴۶] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ”جن کی ساری سعی و جہد دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی۔“ یعنی انہوں نے جو کچھ بھی کیا خدا سے بے نیاز اور آخرت سے بے فکر ہو کر صرف دنیا کے لیے کیا۔ دنیوی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھا۔ دنیا کی کامیابیوں اور خوش حالیوں ہی کو اپنا مقصود بنایا۔ خدا کی ہستی کے اگر قائل ہوئے بھی تو اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ اس کی رضا کیا ہے اور ہمیں کبھی اس کے حضور جا کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ اپنے آپ کو محض ایک خود مختار و غیر ذمہ دار حیوان عاقل سمجھتے رہے جس کے لیے دنیا کی اس چراگاہ سے تمتع کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔

[۴۷] یعنی اس طرح کے لوگوں نے دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے کیے ہوں، بہر حال وہ دنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اپنے قصر اور محلات، اپنی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں، اپنے کارخانے اور معمل، اپنی سڑکیں اور ریلیں، اپنی ایجادیں اور صنعتیں، اپنے علوم و فنون اور اپنی آرٹ گیلریاں، اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے ہیں، ان میں سے تو کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے کہ خدا کی میزان میں اس کو رکھ سکیں۔ وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف مقاصدِ عمل اور نتائجِ عمل ہیں۔ اب اگر کسی کے سارے مقاصد دنیا تک محدود تھے اور نتائجِ عمل بھی اس کو دنیا ہی میں مطلوب تھے اور دنیا میں وہ اپنے نتائجِ عمل دیکھ بھی چکا ہے تو اس کا سب کیا کر یا دنیا نے فانی کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔ آخرت میں جو کچھ پیش کر کے وہ کوئی وزن پاسکتا ہے وہ تو لازماً کوئی ایسا ہی کارنامہ ہونا چاہیے جو اس نے خدا کی رضا کے لیے کیا ہو، اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے کیا ہو اور اُن نتائجِ عمل کو مقصود بنا کر کیا ہو جو آخرت میں نکلنے والے ہیں۔ ایسا کوئی کارنامہ اگر اس کے حساب میں نہیں ہے تو وہ ساری دوڑ دھوپ بلاشبہ کارت گئی جو اس نے دنیا میں کی تھی۔

كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آلِيَّتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝۸۱ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝۸۲ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حَوْلًا ۝۸۳ قُلْ لَّوْكَانَ الْبَحْرُ مَدَادًا لَّكَلَّيْتُ رَبِّي ۝۸۴ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝۸۵ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ فَنَنْكَرَنَّ ۝۸۶ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝۸۷

مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، ان کی میزبانی کے لیے فردوس^[۷۸] کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اُس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو اُن کا جی نہ چاہے گا۔^[۷۹] اے نبیؐ، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں^[۸۰] لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے۔ اے نبیؐ، کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہوا سے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔

[۷۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، المؤمنون، حاشیہ ۱۰۔

[۷۹] یعنی اُس حالت سے بہتر اور کوئی حالت ہوگی ہی نہیں کہ جنت کی زندگی کو اس سے بدل لینے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی خواہش پیدا ہو۔

[۸۰] اللہ تعالیٰ کی ”باتوں“ سے مراد اس کے کام اور کمالات اور عجائب قدرت و حکمت ہیں۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، لقمان،

حاشیہ ۳۸۔